الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
دہشت کے موسم میں لکھی نظمیں
روشِ ندیم

روشن ندیم کی دیگر تصانیف

- ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں
- جدید ادبی تحریکوں کا زوال
- منٹو کی عورتیں
- فیض احمد فیض (فیض صدی: منتخب مضامین)
- ابر کی آہٹ
- تیسری دنیا کا فلسفۂ انکار
- پاکستان: برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک

اشاعتِ اول

القا پبلیکیشنز 2014

'القا پبلیکیشنز' اور ریڈنگز' الان وتال پرائیویٹ لمیٹڈ کے ذیلی ادارے ہیں۔

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبر (ISBN)
978-9-69-640021-9

سرورق: مریم عامر

خط: نوری نستعلیق (15)

طباعت
مکتبہ جدید پریس، ایمپرس روڈ، لاہور

القا پبلیکیشنز

12-K، مین بلیوارڈ، گلبرگ-2، لاہور 54660
پاکستان

فون: 92 42 3575 7877
فیکس: 92 42 3575 5576
publications@readings.com.pk
www.publications.readings.com.pk

انا میکا کے نام

دبیرم،شاعرم،رِندم، ندیمم شیوہا دارم

غالبؔ

ترتیب

گم سم ورق پر دستخط	11
خرابات سے آئے ہوئے خطوط	14
ڈگری، سوٹ اور سگرٹ	18
ایڈن ہائٹس کے چوتھے فلور پر	20
پرانے روزنامچے میں اونگھتے دن	22
اَن کہی آیات کی تلاوت	25
غارِ ثور سے کائنات کا نظارہ	27
کچن کی گھاٹیوں سے بیڈ روم کے ریگزاروں تک	29
گونگے پیمبر اور مبہم صحیفے	32
ایک نئے گناہ کا دعوت نامہ	35
ذہن کا پی سی وَن	37
ماضی کے مضافات میں ایک دوپہر	40

بند کواڑوں کے اس طرف	42
یادوں کے کباڑ خانے سے ایک نظم	44
شہرِ طلسم میں سیاحت کی تمنا	46
بہتے پانیوں پہ پھول کی ناؤ	48
کولمبس کی ڈائری کا ایک ورق.......جو اَن لکھا رہ گیا تھا	51
ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتے گرداب	54
بچھڑے کے پجاری (ایک نظم میڈیا کے لیے)	56
شانتی...شانتی...شانتی	59
اخبار سے شیشے تو صاف کیے جا سکتے ہیں	60
شیطان نیوز کی ہیڈ لائینز	61
گھر سے نکلنے کی تیاری	63
بریکنگ نیوز	65
نظم کا بایوڈیٹا	67
گمنام سپاہی کی موت	69
خیال کی دوری سے بھیجا گیا پیام	71
تم وہ نہیں تھیں جسے دفنایا گیا تھا	73
نو سموکنگ ڈے پر پہلا کش	75
نو سموکنگ ڈے پر دوسرا کش	76
نو سموکنگ ڈے پر تیسرا کش	77
شہر مسلسل کھانس رہا ہے	78

بے بسی احتجاج کر سکتی ہے — 80
مکھیوں کو ناشتے میں ڈائنوسار کیوں دیتے ہو؟ — 82
احتجاج کی نئی بوطیقا۔ 1 — 83
احتجاج کی نئی بوطیقا۔ 2 — 86
درد کی شعریات۔ 1 — 88
درد کی شعریات۔ 2 — 90
می لارڈ! میں تمھیں خبردار کرتا ہوں — 92

گم سم ورق پر دستخط

خدائے پاک کی مرضی

جہاں جیون نشیبوں کا سفر ہو تو..........!

یہ کہتے ہیں:

وہاں نہ دن نکلتا ہے

وہاں نہ شب گزرتی ہے

خدائے پاک کی مرضی

جلال آباد کے مردِ مجاہد، صاحبِ ایمان و دیں

یعنی زمیں گل خان کی بیوہ!!

یہی کچھ ہی برس پہلے

سنا ہے

جب وہ اپنی عمر کے بس 14 ویں زینے پہ اتری تھی

فضا بارود کی اک اجنبی سی باس پہ حیران تھی
اور پوستیں پھولوں پہ پیلے موسموں کا رنگ چھایا تھا
خدائے پاک کی مرضی
فقط اک رائیگانی
درد کی کہنہ کہانی ہے

یہی دن تھے
جلال آباد کا مردِ مجاہد، صاحبِ ایمان و دِیں یعنی زمیں گل خان
کاندھے پر لیے بندوق
اپنے ہاتھ میں تسبیح کے دانے گھماتا
ورد کرتا
موسموں کی سازشوں میں کھو گیا تھا
سو مقدر کے لکھے کا حوصلہ پا کر
کلائی میں جلے خوابوں
ادھوری قربتوں کی چوڑیاں پہنے
عذابِ زندگی کی اوڑھنی اوڑھے
زمیں گل خان کی بیوہ وطن سے دور آ نکلی

خدائے پاک کی مرضی

سنا ہے آج کل وہ شہر کے گنجان حصے سے ذرا ہٹ کر

ادھر 7/6 مرلے کے مکاں نمبر C-28 میں رہتی ہے

جہاں شب تو گزرتی ہے

مگر اک ناتواں دن کی خماری کاٹتی ہے

پھر گزرتی ہے

جہاں دن بھی نکلتا ہے

مگر شب کی ادھوری کروٹوں کی اوٹ سے ہو کر نکلتا ہے

خدائے پاک کی مرضی

مضافاتِ تمنا کے خرابوں میں چھپی پرنور سی آہٹ!

معطر خامشی میں ایک آوارہ مگر محتاط سرگوشی!!

سفیدی کا تقدس اوڑھ کر گم صم پڑے

خالی ورق کے ایک کونے پر گلابی دستخط

..................یعنی مہر خانم!

خدائے پاک کی مرضی

خرابات سے آئے ہوئے خطوط

کون ہیں؟

جو خرابات میں خواب کی اک دریدہ سی چھتری لیے

سورجوں کے سفر پر چلے تھے مگر

منزلوں سے پرے ہی خبر کیا ملی

کہ وہ آنسو بھی اپنے چھپا نہ سکے

شہر کی تنگ وتاریک گلیوں میں

جو دق زدہ پھیپھڑوں میں پڑے گیت کو گنگنا نہ سکے

جو دکھا نہ سکے تھے پرانے وہ خط

حکمرانوں کی دہشت سے جو جیب میں ہی سلے رہ گئے

بے بسوں کی تمنا بتانے کی خواہش لیے ان سنے رہ گئے

ناگاساکی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے

ہیروشیما کے آنسو میں بھیگے ہوئے

کس نے دیکھا مگر بوڑھے کابل کا دکھ!

کس نے سمجھا اسے؟

کس کو جا کر بتائے

کہ سینے پہ اس کے جو بارود کا پھول ہے

اس کے اپنے ہی بیٹے کی بندوق کی دین ہے

اس کی اک ٹانگ اب جو کہ لکڑی کی ہے

وہ پڑوسی سے اس کی پرانی رفاقت میں لپٹا ہوا بھید ہے

کیسے کھولے اسے!!

وہ تو چپ چاپ ہی اپنی تاریخ کا بوجھ ڈھوتا رہا

قرن ہا قرن زخموں سے رستا لہو وہ چھپاتا رہا

پر وہ رو نہ سکا

بانجھ صحراؤں میں پھول زیتون کے وہ اگا نہ سکا

کون ہیں!

اب بھلا کون ہیں؟

جو کہیں کہ نئے دور کے اس خداوندِ قدوس کو

آپ کوثر میں جو نیند کی گولیاں دے رہا ہے

وہ جبریل ہے

اور جو آواز کے نرخرے میں خموشی کے پتھر کو لڑھکا رہا ہے

سرافیل ہے

کون ہیں!

اب بھلا کون ہیں؟

جو کہ آنکھوں میں نیندوں کا سرمہ سجا کر پڑے

اس خدا کو بتا دیں

کہ اس کے مقرب فرشتوں نے

فردوس تک بیچ کر اپنی جیبیں بھری ہیں

سو کواڑوں کو اندر سے تالے لگا کر

مکانوں میں سہمے ہوئے جاگتو!!

کہ محاذوں سے تم تک خبر ایسی پہنچے

کہ سرحد پہ اب خندقوں کی جگہ۔ پر دکانیں کھلی ہیں

سپاہی اب اپنے ہی تمغوں کی بولی لگانے میں مصروف ہیں

تو سمجھ لینا

سپنے، تمنائیں، راہیں، منازل

.... یا جو کچھ بچا ہے

وہ نیلام ہوگا

سرِ عام ہوگا
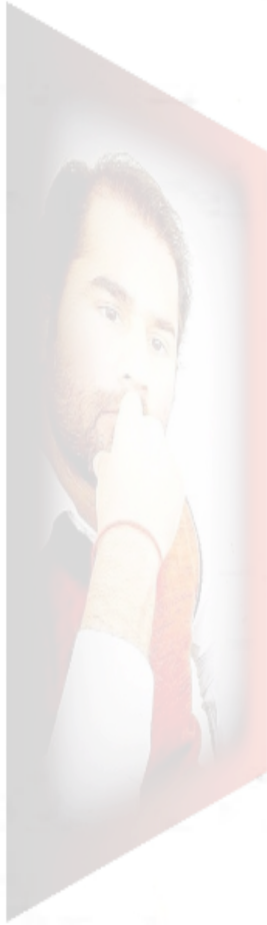
ڈگری، سوٹ اور سگرٹ

بہت بوڑھے

بہت بوڑھے زمانوں نے

(جو رہتے ہیں ہمارے حافظے کے ان جزیروں میں

جہاں تاریکیوں کا راج پھیلا ہے)

ہمارے سر میں بارودی سرنگیں

اور رگوں میں تارپیڈو باندھ رکھے ہیں

مگر یونہی سلگتی کوئی چنگاری..........!

کوئی نعرہ

کوئی بینر

کوئی تقریر

جس کی آخری تہہ میں کوئی عیار قاتل

ماچسوں کی تیلیاں تھامے کھڑا ہے

مسکراتا ہے

کوئی اپنا ہی آوارہ تفکّر

جو کہ وحشت کے نشے میں چور بے خود ڈگمگاتا ہے

بغاوت کی کوئی اک موج جس کو ہر کنارے سے کوئی ضد ہے

کسی بھی تارپیڈو کو

کسی بارود کے خاموش شعلے کو کبھی بھی چھیڑ سکتے ہیں

کسی کالج کی اک ڈگری

چمکتا سوٹ اور ٹائی

موبائل، قیمتی گاڑی

(رگوں میں تارپیڈو

سر میں بارودی سرنگیں)

اور لبوں میں جلتا اک سگرٹ..............!!

ہمارے اَن دیکھے دھاگے

ہلاتی ایک بڑھیا ہے

بہت بوڑھے زمانوں کی اندھیری اوٹ میں بیٹھی

جسے تاریخ کہتے ہیں

کسی عاقل کا کہنا ہے

ایڈن ہائٹس کے چوتھے فلور پر

گولڈ لیف کا خالی پیکٹ
حیش بھرا اک سگرٹ
خالی بوتل وڈکا کی اور بچی کھچی کچھ نمکو
چاروں جانب پھیل رہی ہے جلتے سگرٹ کی بُو
تیز دھوئیں کی چبھن اور اس سے نم آلود سی آنکھیں
جن کے اندر دہک رہا ہے خواب کا ایک الاؤ
پلکوں کے بالا خانے میں اونگھتی ایک اداسی
روح کے گہرے پاتالوں میں بل کھاتے گرداب
یادوں کے گلدان کی قیدی پژمردہ سی کلیاں
سوچ کے اندر گونجے کڑوے باداموں کی باس
دکھ اور غم سے اٹی ہوئی ہے جیون کی رہداری
جس میں بکھرے پڑے ہوئے ہیں سرخ کانچ کے آنسو

چاروں اور ہے تاریخوں سے خالی ایک کیلنڈر

کتنے بے موسم ہیں اب تو سارے جون دسمبر

اب تو خود ہی سہے نہ جائیں یخ سانسوں کے جھکڑ

ناں راتوں کا خوف ہے کوئی، ناں شاموں کا دھڑکا

بجھتے خواب میں ہانپتی چنگاری کا کیسا کھٹکا

کوئی بتائے اب صبحوں کو ڈوبتے دن کی سازش

کن شانوں پر ہاتھ رکھیں اب بوڑھی اندھی راتیں

رہ گئیں ٹکٹیں جیب کے اندر آئی نہ کوئی گاڑی

چاروں اور ہے شیاں شاں کرتا رات کا ایک سٹیشن

رہ گئی بوتل وڈکا کی

..................اور ے حے ے ے ش بھراا

اِک سگ ر ر ر ٹ

پرانے روزنامچے میں اونگھتے دن

انامیکا!

اگر ان ہی دنوں ہم سے خدا بھی پوچھتا

تو ہم فقط اپنی لِکھت کی ہی قسم کھاتے

ہمیں پورا یقیں تھا

جو بھی لکھیں گے فلک پر کہکشاں بن کر ہمیشہ مسکرائے گا

مکاں کے حافظے میں اور زماں کی لوح پر

ازلوں تلک وہ جگمگائے گا

..................یہ اس موسم کا قصہ ہے

کہ جب اندھے یقیں کی عمر کا نشہ

جوانی کی امنگ

اور دل کے کہنے پر سبھی کچھ کر گزرنے کا

کوئی لاوا رگ و پے میں دھڑکتا تھا

صحیفے، آسماں، یہ کائناتیں اور خدا

ہم کو بھی کچھ ہیچ لگتا تھا

فقط اپنا ہی ہونا آخری سچ تھا

گو ایسا تھا

کہ اک افلاس کا تپتا ہوا سورج ہمارے سر پہ رہتا تھا

ہمیں بس بے کراں سی بھوک تھی

اتنے بڑے عالم میں پلتی ایک اک شے کی

کوئی خفگی، کوئی غصہ، کوئی ناراضگی بے دید سی شے سے

جسے ہم جانتے کب تھے؟

کوئی بے شکل سی، بے نام سی اک آرزو کا سحر تھا

جس میں ہمیشہ ڈوبے رہتے تھے

جسے ہم مانتے کب تھے؟

کسی آدرش میں بھیگی ہوئی اک تابنا کی تھی

کہ اپنے خون سے اس ساری دنیا کو نیا پھر سے بنائیں گے

فلک کو چومتے کہسار جیسا اک ارادہ تھا

کہ جو لکھے ہوئے لفظوں کی شریانوں میں بہتا تھا

قلم بارود کے دریا اگلتا تھا

تخیل پر دہکتی آبشاریں راج کرتی تھی

فقط تاراجیٔ دنیا..................!

فقط بربادیٔ ماضی...............!!

مگر اک خوبصورت سی نئی دنیا بسانے کو

نیا انساں بنانے کو

سو ہم کو یہ یقیں تھا جو بھی لکھیں گے

فلک پہ کہکشاں بن کر ازل تک مسکرائے گا

انا میکا!

مگر یہ وقت کا پتھر قلم کی ضرب سے کس طور ٹوٹے گا!!

(راشد، عابد، شاہد، ناصر اور سعید کے نام)

ان کہی آیات کی تلاوت

یہی انساں!

مری تنہائیوں میں رینگتی اکتاہٹوں

ازلوں سے پھیلی فرصتوں

کی بے خیالی کا تماشا ہے

ابھی کل تک تو یہ بھونچال اور طغیانیوں کو

میرا غصہ جان کر

کیسے لرزتا، گڑگڑاتا، معبدوں میں سر جھکائے

میری اک نظرِ عنایت کا بھکاری تھا

مگر دیکھو!

کہ کیسا، فارمولے ایٹمی بم کے، کلوننگ کے

یہ اپنی جیب میں رکھے، خدا بن کر کھڑا اِترائے جاتا ہے

اور اپنی کچھ کتب کے زعم میں آکر

بڑے انداز سے

میرے صحیفوں کی ورق گردانیاں کر کر کے

ہنستا اور ہنساتا ہے

سمجھتا ہے کہ میں اس بے کراں عالم میں اِک بے کار پُرزہ ہوں

کہ جو ازلوں سے بس عرشِ معلیٰ پر

فرشتوں کے جلو میں

گاؤ تکیوں سے لگا کر ٹیک بیٹھا اونگھتا رہتا ہے

پر ادنیٰ مشینوں اور کتابوں کے نشے میں جھومتا انسان کیا جانے؟

فقط دو چار دم میں یہ بڑا عالم کھڑا کرنا

ستاروں، کہکشاؤں کو ہمیشہ کے لیے ان کے مداروں پر گھمانا

اور پہاڑوں، ساگروں اور آندھیوں کو ہاتھ میں رکھنا

پھر اس بے مثل پیچیدہ نظامت کی نگہبانی

.... بڑا مشکل، بڑا مشکل عمل ہے یہ!

ابھی ابلیسِ نافرمان کا قصہ یہی کل کی کہانی ہے!!

سو ازلوں سے بس اک لحظہ بھی میں تو سو نہیں پایا

ٹکے بھر کا یہ انساں کیا سمجھتا ہے!

خدا ہونا کوئی آسان ہوتا ہے!!

غارِ ثور سے کائنات کا نظارہ

انا مِکا! سُن

میں کیسے تاریخ کے وہ سارے رجسٹروں کو ہی پھاڑ دیتا

پھر ان کے ٹکڑے گئے زمانوں کے کوڑے دانوں میں پھینک آتا

اور اپنی مرضی سے اک نئے دودھیا ورق پر پھر اپنا ماضی بکھیر دیتا

یہ ایسا آسان بھی نہیں تھا

سو کیا میں کرتا

کہ میں جو تاریخ کی شرارت

اسی کی شوخی کا شاخسانہ

خدا کی مٹھی سے دھیرے دھیرے پھسلتی جاتی کوئی کہانی؟

کہ نامکمل سی کوئی تمثیل؟

میں اس کی عِلت ہوں یا نتیجہ؟

میں اس کا فنکار ہوں کہ فن ہوں؟

ازل سے جاری کسی ڈرامے کا کوئی ہیرو

کہ بس اضافی سا کوئی کردار

انا ہکا! بات ایسی آسان بھی نہیں تھی

سو میں اٹھا

اور ہاتھ جھاڑے

ذرا سا چوگرد میں نے دیکھا

بیاض تھامی

بڑی خموشی سے اس زمان و مکاں کے جھنجھٹ سے لوٹ آیا

کچن کی گھاٹیوں سے بیڈروم کے ریگزاروں تک

اک دن ہم نے باہر پھیلے عالم کو جوتے کی نوک پہ رکھا

چاردواری کی اس بے آباد بہشت میں اترے

تھوڑی دیر کو اکتاہٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھے

اور سفر کا سوچا

اپنی بہت پرانی تحریروں کا کھوج لگایا

آخر ڈھونڈ نکالے ہم نے

نامعلوم سی دنیاؤں کے کٹے پھٹے سے نقشے

دل کے کونے کھدرے سے کچھ ہمت ڈھونڈ نکالی

ایک ارادہ ٹوٹا پھوٹا عجلت کا زخمایا

سب کو ہم نے باری باری اپنے بیگ میں رکھا

ساتھ میں رکھ لیں کچھ یادیں، کچھ کرنے کی مجبوری

ہاتھ میں تھاما ایک قلم اور کاغذ کے کچھ دستے

کچھ لمحے کو پھر سے دُور دراز سفر پہ سوچا

اور کچھ سوچ کے ساتھ رکھے دو چرس سے بھر کر سگرٹ

اک بوتل وُڈکا کی رکھی، ساتھ رکھا اک اڑھا

نمکو کو جیبوں میں ٹھونسا، کانوں میں موسیقی

یہ سارا سامان اٹھا کر

سات جہان اور سات سمندر پار سے آگے

دووووووووور نگر کے

ایک گھنے جنگل میں کھلتی نیلی کلیاں پا لینے کو

تنہائی اور یکسانی کی اک الجھن سلجھا لینے کو

آخر ہم بھی نکلے

...........چلتے چلتے

چلتے چلتے کچن کے سبزہ زار میں جا کر نکلے

تھک کر دو پہریں بیٹھک کے چٹیل صحرا کی خاک اُڑاتے کاٹیں

ایک مسافت کاٹ کے ٹیرس کے اونچے کہساروں کو پاٹا

اور آنگن کے ویرانوں میں اترے

اگلی منزل کوریڈور کی وہ گھاٹی تھی

جس سے ہم نکلے ہی تھے کہ سورج ڈوب گیا تھا

لیکن پھر بھی ہمت کر کے آخر خلوت گاہ کے ایک گھنے جنگل جا پہنچے

وہ جنگل کہ جس کے خوف سے

پہلے بھی ہم لوٹ آئے تھے

رات کا پورا ایک بجا تھا

کلیاں اب بھی دور بہت تھیں

سو کیا کرتے؟

...................نیند ہما اا ری قا ااا تل تھی ی ی ی ی!!
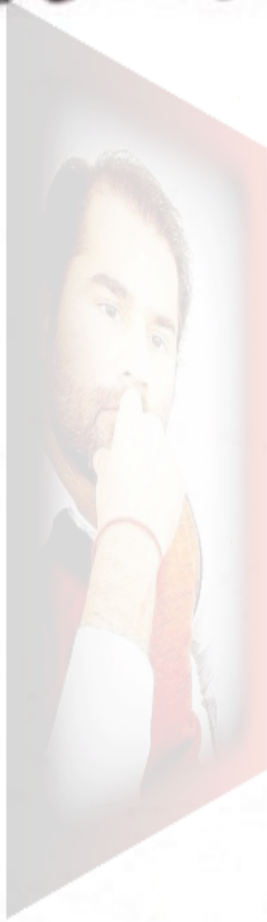
گونگے پیمبر اور مبہم صحیفے

جن بستیوں کے نیچے نمکین دلدلیں ہیں
سیال کیچڑوں میں کالی رطوبتیں ہیں
تیزاب کے ہیں جوہڑ، گندھک کی آبنائے
اور منطقوں میں پھیلی زہراب کی ہے دہشت
اور گھورتی ہے سب کو بارود کی ہلاکت
سبزے ہیں جن سے لرزاں
ہیں ندیاں بھی سہمی
سو کون یہ بتائے..............

دریاؤں کی تہوں میں اب دشت پل رہے ہیں
اور وادیوں کے نیچے صحرا مچل رہے ہیں
سورج پگھل رہے ہیں

یادوں کے اک بھنور سے آواز جھانکتی ہے
اور ماضیوں کے دھندلے اوراق پر لکھا ہے
کچھ سبز وادیاں تھیں دل دیوتا کا معبد
اور نیلگوں تھیں جھیلیں گُل دیویوں کا مسکن
ان کھوئے مسکنوں کے کچھ زائچوں کے ٹکڑے
اور مٹتے معبدوں کا آدھا ادھورا نقشہ
کچھ خواب میں بسا ہے
کچھ خواہشوں کے دل میں
پر مسکنوں کے مالک اب پانیوں کے تاجر
اور معبدوں کے آقا یہ تیل کے سوداگر
تیزاب کے محقق
گندھک کے کیمیا گر

ان سبز وادیوں کے اے تازہ تر خداوند!
اے بحر و بر کے مولا!!
مبہم ترے صحیفے کن بے رُتوں میں اترے

بے علم جن کے قاری

گونگے ترے پیمبر، بہرے ترے پجاری
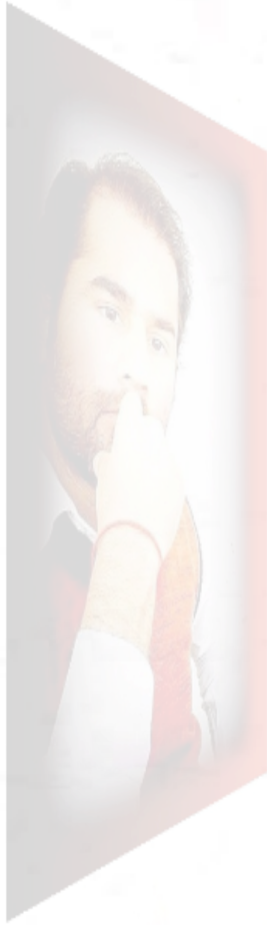
ایک نئے گناہ کا دعوت نامہ

سُن !

لفظوں کے جھرمٹ میں چھپی

چپ چاپ کھڑی سچائی سُن !!

چُن !!

حرفوں کے بیجوں سے اُگی بیلوں پہ کِھلی مہکاریں چُن !!

یہ لفظ تو بس دیواریں ہیں

دیواروں میں اک درز بنا

اُس پار شفق کے پاس بسے

اک خواب نگر کے گیت کی دُھن

وہ دُھن جو زماں کی لہروں پر ازلوں سے مچلتی رہتی ہے

جو سچ کے جل تھل ساگر میں دھیرے سے دھڑکتی رہتی ہے

اس خواب کے پردے کو تو ہٹا

اور ڈھونڈ ذرا دل مندر کی اس راز بھری گہرائی میں
اور دیکھ قیامت کا منظر
اِک نئی صداقت کا منظر

(راشد سلیم، عطا تراب اور ثاقب ندیم کے لیے)

ذہن کا پی سی وَن

(1)

باغ ہے..............!

یہ جو سنسان سا باغ ہے!!

(اس خرابے کو یہ نام دینے پہ میں معذرت چاہتا ہوں)

کہ اس اونگھتے حافظے سے پرے تا بہ حدِ نظر دور پھیلا ہوا باغ ہے

جس میں کتنے زمانوں کا اُگتا ہوا جھاڑ جھنکاڑ ہے

کتنی الجھی ہوئی اور خودرو سی بیلیں ہیں

جن پر کئی بدنما پھول ہیں

جنگلی گھاس میں زہر آلود کانٹوں بھری اَن گنت جھاڑیاں

جن پہ آسیب کا گہرا سایہ پڑا ہے

درندے ہیں جن کی گرج میرے بیڈ روم تک آتی رہتی ہے

مجھ کو ڈراتی ہے

اور اِک بھیانگی کا خدا

جو اناؤں کا مارا ہوا

نیم پاگل

زمان و مکاں سے ورا ہے

یہاں حکمراں ہے

(میں خود بھی اسی کی اطاعت کا مارا ہوا ہوں)

(2)

یہاں باغ کے اس طرف تھوڑی خالی جگہ ہے

برائے تحفظ جہاں ایک دیوارسی چُن رکھی ہے

مگر پھر بھی آسیب

وحشی درندوں کی صورت ہمیشہ اسے پھاند کر آتے جاتے ہیں

(3)

اور اس طرف ہی مری اک حویلی ہے

جو میرے ماں باپ نے مجھ کو ورثے میں دی ہے

کہ جس کی سجاوٹ میں

سیلے کواڑوں کو، مکڑی کے جالوں کو

رِستی چھتوں اور کائی میں لپٹے ستونوں وغیرہ کو

سب کو چھپایا ہوا ہے

نیا سا بنایا ہوا ہے

فرانسیسی، انگلش کتابوں، حسیں مخملوں سے

مغل منی ایچر، ہڑپہ سے نکلی ہوئی مورتی اور گوتم کے بت سے

عرب اور ایراں کے کم خواب پردوں سے، خطاطیوں سے

حویلی کی تزئین کی ہے

میں خوش ہوں کہ اپنی حویلی پہ اب بھی مرا حکم چلتا ہے

یہ میری اِک راجدھانی ہے

لیکن محلے میں خرابے کی دہشت ہے

آسیب راتوں کا سایہ

درندوں کا خطرہ بہت ہے یہاں

ماضی کے مضافات میں ایک دوپہر

جون کی ویران دوپہروں کی بوجھل راہ پر
گاہے گاہے گونجتے کچھ نامکمل گیت سے
جن کے دل سے جھانکتا ہے اونگھتے خوابوں کا دکھ
ساتھ جن کے رو رہی ہے بے زباں دھڑکن کی تھاپ
ماضیوں کی گونج میں مٹتا ہوا دن کا نگر
جس کے اندر رہ گئے ہیں زندگی کے ماہتاب
دور تک الجھی ہوئی یادوں کی زلفوں کا سفر
سوچ کے کھنڈرات میں کھوئے ہوئے کچھ قہقہے
خواب کے اہرام میں سوئی ہوئی کچھ سسکیاں
اَن کہی باتوں کے کملائے ہوئے گیندے کے پھول
اَن کہے الفاظ کے ہاتھوں سے گرتی کرچیاں
ایک بوسیدہ ٹشو پیپر پہ لکھی شاعری

اِک پرانی ڈائری سے جھانکتی کچھ پتیاں

یوں ہی بس بیٹھے بٹھائے کس طرح سے کھل گیا
دور کی دنیاؤں کی مہکی ہوئی آہٹ کا در
پار جس کے ہانپتے صحرا کی اڑتی ریت ہے
ریت کے ان قلزموں میں ڈوبتی ہے خامشی
خامشی میں ڈوبتا جاتا ہے اب سانسوں کا شور

وقت کی اونچی، بہت اونچی فصیلوں سے پرے
کس نے دیکھا یوکلپٹس پر اُگا ننھا سا پھول

بند کواڑوں کے اس طرف

کب سنتے ہیں.........!

یہ دروازے آخر دستک کب سنتے ہیں؟

کب کھلتے ہیں...........!!

ہر آجانے والے پر یہ کب کھلتے ہیں؟

ہم تو بس دہلیز پہ رک کر

ہاتھ میں تازہ پھول لیے

تکتے رہتے ہیں

اپنا آپ وہ کس پر کھولیں کون یہ جانے؟

بھید بھرے رنگلے دروازے کب سنتے ہیں

جیون کے چوراہے پر میں آج یہ بیٹھا سوچ رہا ہوں

بے دیوار گلی کوچوں میں وہ دروازہ

جس کے پار سنا تھا میں نے میرے خواب کی دنیا بھی ہے
اس کی چاہ میں کتنے برسوں
دستک کا گلدستہ اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑا رہا تھا
سوچ رہا تھا
ہو سکتا ہے وہ دروازہ میرے لمس کے اسمِ اعظم سے کھل جائے
اور میں اک دن چوکھٹ کے اس پار کی وادی میں جا اتروں
موسم بدلے، عمریں بیتیں
پر وہ دستک اب تک میرے خواب میں بیٹھی اونگھ رہی ہے
پوروں پر اک خون سی سرخی بے آواز سی دستک بن کر
آشا کے اہراموں اندر گونج رہی ہے

اے عمروں کی چوکھٹ کے بوڑھے دروازے!
مجھ پر اک دن کھول دے خود کو
اک دن خود پر کھول دے مجھ کو

(عاصم بٹ کے لیے)

یادوں کے کباڑ خانے سے ایک نظم

لیے ہاتھوں میں اِک تھیلا اور اِک فہرست اشیاء کی
زمانوں کا ئناتوں سے ذراہٹ کر
کسی بے رنگ سے اک دھیان میں ڈوبا
یونہی چلتے ہوئے بازار کی جانب
اچانک اِک خیال آیا تو یاد آیا
وہ منظر جو مری کچھ انجھانی آرزوؤں نے
یہی کچھ دس برس پہلے ہواؤں کی ہتھیلی پر بنایا تھا
تمھارے قرب کا اک حادثہ سوچوں میں در آیا
تمھارے اتفاقی لمس کی اِک سرسراہٹ
میری پوروں میں مہک اٹھی
سماعت میں تمھارے ہونٹ کی دھیمی چٹک جاگی
کسی قلزم میں سوئی آبشاروں کی ہنسی جیسی

جسے میں اُن دنوں اپنے لیے مبہم سا سندیسہ سمجھتا تھا

(نجانے کتنی راتوں تک تمھارے دل میں

مَیں اپنے ہی ہونے کے گماں میں سو نہ پایا تھا)

سو وہ میرے لیے اب تک

کوئی ازلوں کی لوحوں پر لکھی تحریر کا اک اجنبی سا بھید ہے کوئی

پر اس کے بعد پہلے موسموں کی سازشوں میں

ہونٹ، دل، آنکھیں، مہک اور خواب

سب کچھ کھو گیا تھا

اب اس آدھی ادھوری سی کہانی کی وہ دیگر گمشدہ کڑیاں

زمانوں کے کسی گودام میں ہونگی

لیے ہاتھوں میں اِک تھیلا اور اِک فہرست اشیاء کی

یونہی چلتے ہوئے بازار کی جانب

اچانک اک خیال آیا

تو یاد آیا ....

شہرِ طلسم میں سیاحت کی تمنا

سُنو!

معذرت چاہتا ہوں!

وہ جو کچھ بھی تھا

.........وہ محبت نہیں تھی

قسم سے نہیں تھی!

میں بھی جانتا تھا

مگر یہ یقیں ہے تمہیں بھی خبر تھی

وہ اِک بھوک تھی

جو کہ پژمردہ روحوں کے باطن میں

سالوں پڑی تھک گئی تھی

وہ ڈائن کی مانند معصوم خواہش کے بہروپ میں

تیری دہلیز پر ہانپتی تھی

تجھے مانگتی تھی

مگر بات اتنی سی تھی

میں ترے اجنبی اونچے نیچے حسیں شہر میں

ٹھہرنا چاہتا تھا

تری وادیوں میں بھٹکتا ہوا

بے خودی کی مدھر بارشوں میں فقط بھیگنا چاہتا تھا

تری ممٹیوں سے اترتے ہوئے

جادوئی گھاٹیوں کی تھکن چاہتا تھا

کسی ڈولتے، ٹوٹتے پیڑ سی بے بسی چاہتا تھا

فقط بات یہ تھی کہ میں

چوکھٹوں میں سجی فوٹوؤں کی سی یہ زندگی کاٹتا کاٹتا مر چلا تھا

بہتے پانیوں پہ پھول کی ناؤ

حصارِ خواب میں گم سم

کنارِ آب پر حیراں

کہانی نامکمل ہے

کہ وہ اب تک نہیں لوٹی

جو کچی گاگریں بھرنے گئی تو عکس بہتے پانیوں پر بھول آئی تھی

وہ کھوئے عکس کا دکھ تھا

جسے تم گیت سمجھے تھے

اے بہتے پانیو!

اس کو بچا لینا کہ لہروں سے پھسل کر ٹوٹ نہ جائے

کسی اندھے بھنور کی دلدلوں میں ڈوب نہ جائے

پہ بہتے پانیوں پہ کس طرح کوئی یقیں کر لے
کہ جن کی قسمتوں میں لوٹنا، رکنا کہیں لکھا نہیں ہوتا
فرازی کی انا اوڑھے نشیبوں کی پناہوں میں سدا بہتے چلے جانا
ازل کے آسمانوں کا کہا سہتے چلے جانا
اے بہتے پانیو! تم کو مبارک بے ارادہ ہجرتوں کا نم
کہ تم ٹھہرے، بہت نٹ کھٹ، بہت ضدی مزاجوں کے
سدا راہی بہت گم سم بہت بے نام راہوں کے
مگر اک خوف کی ناگن پڑی ہے کینچلی جھاڑے
کہیں ایسا نہ ہو جائے
کہ کوئی برف کا موسم تمھاری راہ تکتا ہو
یا ڈائن خشک سالی کی تمھیں برباد ہی کر دے
مگر وہ عکسِ گم گشتہ.......!!
پڑا ہے جو کسی کے خواب زاروں میں
تمنا کے کہیں اجڑے دیاروں میں

کہانی لڑکیوں کی ہو
کہانی پانیوں کی ہو
کہانی تو کہانی ہے

مکمل ہو بھی جائے تو

کسے کس نے سنانی ہے؟
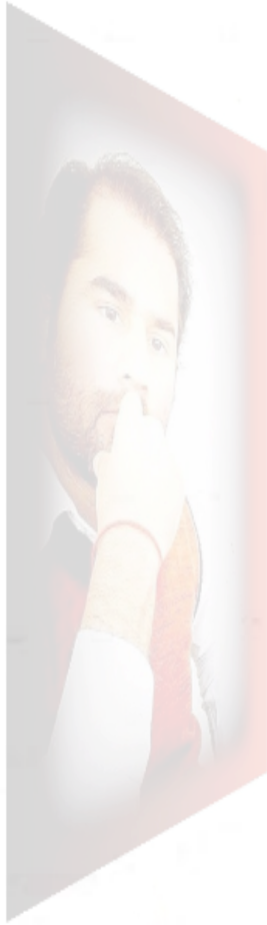
کولمبس کی ڈائری کا ایک ورق......

جو اَن لکھا رہ گیا تھا

(مورخہ 9 ستمبر 2001ء، وقت 8:46)

سنا ہے........!

کہ اب وہ بڑے ہی تفاخر سے بگ بینگ سے اپنا رشتہ جتاتا ہے

جس نے کہ اپنی ولادت کا قصہ

پرانی دریدہ کتابوں سے خود اپنے ہاتھوں مٹایا تھا

اب وہ بڑی نرگسیت سے اپنے سے ہی بات کرتا ہے

اور قہقہہ وار ہنستا ہے

یونہی لڑکپن سی شوخی میں آ کر

وہ ٹکنالوجی اور مشینوں کے جادو دکھاتا ہے

یا پھر اچانک ہی چہرے پہ اپنے متانت سجا کر

خرد کی نئی الجھنوں پر پریشان ہوتا

ترقی پسندی وایجابیت، سرّیت، تجربیت

پرانی نئی ساختیت وغیرہ پہ گھنٹوں بحثتا ہے

زہرہ عطارد سے آگے ستاروں پہ کالونیوں کے علاوہ

گلوبل ولیج کی پلاننگ کے نقشے دکھا کر بڑی ہی ادا سے

وہ آئندہ سالوں کی مصروفیت بھی بتاتا ہے

یا ٹانگ پر ٹانگ رکھے

دھوئیں کے ہر اِک کش پہ ہنستا ہوا

اپنے بڑھتے ہوئے کاروبار اور سرمائے پر بات کرتا ہے

جس میں فقط افریقہ، ایشیا کی یہ سونا اگلتی زمینوں

وسیع منڈیوں، معدنی تیل اور پانیوں کے

ذخیروں وغیرہ کا ہی تذکرہ ہے

کبھی اپنی کرسی کے بازو پہ گھونسے چلاتا ہوا

جرمنی کے کسی فلسفی کو بڑی ہی حقارت سے وہ یاد کرتا ہے

اور پھر بشاشت سے اعلان کرتا ہے کہ

"اب یہ میرا زمانہ ہے، میں اس کا حاکم ہوں

سو اس سیارے کی قسمت میں جو کچھ بھی ہوگا

مرے دم سے ہوگا

ہوائیں، گھٹائیں مری حکمتوں کی سزاوار ہوں گی"

وہ بس ایٹمی موم کی بتیوں کے جلو میں

اک عینک غلط فہمیوں کی لگائے کہے جا رہا ہے

وہ دیوارِ گریہ و بابل کی گلیاں

وہ عشتار دیوی کا مندر و معبد

وہ موہنجوداڑو، اجنتا، ایلورا

وہ یونان و روما، وہ دلی، بخارا

یہ بگ بینگ کا ایک نادان بچہ!

کہاں جانتا ہے؟

اسے کیا خبر ہے؟

کہ یہ سب گزرتے زماں کا بس اک کھوکھلا قہقہہ ہیں
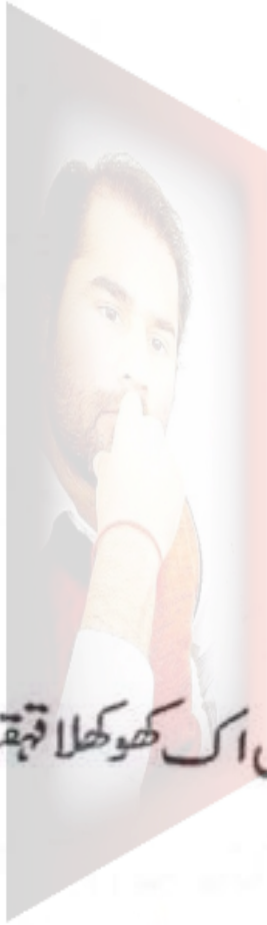
ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتے گرداب

چند آنکھیں

میں جن کے دھیان میں ہوں

چند آنکھیں

جو میرے دھیان میں ہیں

اک تسلسل سے میری گھات میں ہیں

کالی راتوں کی خامشی سے پرے

دن کی بے چین رونقوں سے ادھر

خوردبینوں سے، دوربینوں سے

میرے اندر سے، میرے باہر سے

بے وفائی سے دیکھتی ہیں مجھے

کن دماغوں کی آئینہ ہیں یہ

ہیں یہ عکاس کن ارادوں کی

میں کہ کاغذ کے اجلے فرشوں پر اجنبی راہ کھوجنے والا
میں کہ اقرار کی خموشی میں ایک انکار سوچنے والا
عام گلیوں میں اور محلوں میں
قہوہ خانوں میں، مارکیٹوں میں
ہسپتالوں کی راہداری میں
کالجوں کی حدود کے اندر
مجھ پہ پہرے کڑے ہیں آنکھوں کے
مجھ کو ڈر ہے نہ ایسا ہو جائے
اِک تسلسل سے گھورتی آنکھیں
میرے اندر کہیں نہ اُگ آئیں
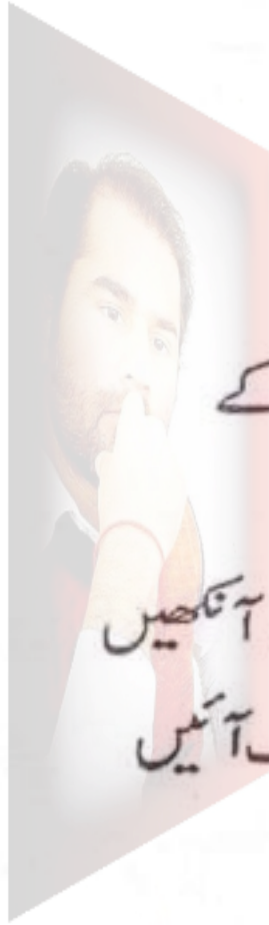
بچھڑے کے پجاری

(ایک نظم میڈیا کے لیے)

کبھی کلی کی حسیں چٹخ کو وہ ایک بگ بینگ کہہ رہا ہے

کبھی قیامت کے سانحے کو ذرا سی آہٹ بتا رہا ہے

خموش لوگو!

یہ کس کو تم سب نے عہدِ نو کا رسول مانا ہوا ہے جو کہ

الٰہیت کا سفیر بھی ہے

تو شیطنت کا ہے ترجماں بھی

حسین صبحوں کا رام بھی ہے

سیاہ راتوں کا راکشس بھی

اسی کے ہاتھوں میں تازیانہ

اسی کے ہاتھوں میں پھول دستہ

نہ کوئی کعبہ

نہ کوئی قبلہ

یہ کس خدا کا پیامبر ہے؟

جو جھوٹی آیات کے بہانے خموش لوگوں کو لوٹتا ہے

(عظیم روسو! معاف کرنا کہ آج انسان پھر سے زنجیر ہو گیا ہے)

قسم ہے اس مضطرب زماں کی!

کہ لوگ ذلت کی دلدلوں میں گھرے ہوئے ہیں

مگر وہ خوش ہیں

کہ دلدلوں کو نیا پیمبر تو ایک جنت بتا رہا ہے

نئی بشارت سنا رہا ہے

اسی خوشی میں خدا کے قدوس کو سنہرے سپاس نامے

حسین لفافوں میں بھیجتے ہیں

وہ تازیانوں کو اس کے منشا کی سرخ کلیاں سمجھ رہے ہیں

انھیں خبر کیا

خدا خموشی کی سبز شالوں کو کاڑھنے میں بہت مگن ہے!

"یہ لوگ طاقت.........!

یہ لوگ عامل..............!!

یہ لوگ تاریخ کا تحرک......!!!"

(کسے خبر ہے کہ مارکسیت کا پیرِ کامل

زمیں میں لیٹا خود اپنے لکھے پہ ہنس رہا ہے کہ رو رہا ہے)

دسمبروں کی جبیں پہ دیکھو نحیف بوندیں چمک رہی ہیں

تو جُون سردی سے مر رہے ہیں

کہ عہدِ نو میں پرانے کینوس کے سب مناظر بدل رہے ہیں

قدیم چرمی کتابچوں میں لکھا تھا جو بھی بدل رہا ہے

ورق ورق ہے یہ اک کہانی

سبق سبق ایک خود کلامی

خدائے برتر! نئے پیمبر ترے صحیفوں کی

آیتوں کے تمام معنی بدل رہے ہیں

سو کون تعبیر ان کی لکھے؟

کہ خواب تک کو زمانہ کوڑے کے ڈھیر پر اب گرا چکا ہے

مفکروں نے، مورخوں نے بھی اپنا پیشہ بدل لیا ہے

اور آج کل وہ معیشتوں کی زبور لکھنے میں منہمک ہیں

رسد کی ویدیں، طلب کے قرآن لکھ رہے ہیں

سو کیا ارسطو کو اب بتائیں

کہ مخزنیہ کے اصول سارے بدل چکے ہیں

شانتی... شانتی... شانتی

پھینک دیا ہے قلم بھی، سفید کاغذ بھی
انڈیل دی ہے سیاہی ادھوری نظموں پر
جلا دی اپنے ہی ہاتھوں سے ہر غزل اپنی
گرا دیا ہے بیاضوں کو کوڑے دانوں میں
سو خواب کا ہے تکلف، نہ آس کا جھنجھٹ
نہ حسرتوں کا الم ہے، نہ آرزو کا ملال
نہ رنج کی ہے شکایت، نہ درد کا شکوہ
ہواؤ! آؤ کہ اب گر گئے ہیں سارے کواڑ
ہواؤ! آؤ کہ اب ڈھے گئی ہیں دیواریں

اخبار سے شیشے تو صاف کیے جا سکتے ہیں

خبروں کے اندھے جنگل میں بے خبری کی موت
بے خبری کے راج میں لپٹا ہے تازہ اخبار
جس کے لفظوں سے چھا نکلے ہے اندھیارے کا خوف
جس کی شہ سرخی سے ٹپکے روشنیوں کا خون
گلتے کالم، سڑتے شذرے، بوسیدہ اقوال
آئندہ کے مخبر لاؤ وہ سچا سندیس
جس سے مہکے گھر آنگن میں امیدوں کی باس
جس کے سرنامے پر چمکے مستقبل کی آس

شیطان نیوز کی ہیڈ لائنز

گوتم نے نروان کی تلاش میں امریکہ دریافت کرلیا

فرعون کی طرف سے ریفرنڈم کروانے کی یقین دہانی

یسوع نے نئے عہد نامے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا

ابلیس کی طرف سے خدا کے ساتھ بیک ڈورڈپلومیسی کا ایک اور دعویٰ

کوفہ کی سٹاک ایکسچینج میں آج بھی مندی کا رجحان رہا

ابراہیم کے ہاتھوں برن سنٹر کا شاندار افتتاح

دوزخ میں انرجی کا بحران: آگ کے لیے ایندھن کی شدید کمی

جنت میں خوراک کا بحران: جنتیوں میں ہنگامے پھوٹ پڑے

ہالی وڈ کی طرف سے طوفانِ نوح پر ٹائی ٹینک ٹو بنانے کا اعلان

کربلا میں منرل واٹر کی ترسیل پر اتفاق رائے: ایک تجارتی کمپنی کا انکشاف

عدلیہ نے داس کیپیٹال کو فحش قرار دے دیا

پہاڑی سے اترتے ہی موسیٰ پر رسالت سے استعفیٰ کے لیے دباؤ

یاہو میسنجر کی طرف سے جبرائیل کو ملازمت کی پیشکش پر غور

زلیخا، یوسف کے نام ایک خط چھوڑ کر لاپتہ ہو گئی ہے

گھریلو ناچاقی پر رام نے سیتا کو گولی مار دی

او پڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا

دی منگ دی دال آف دی...............!!
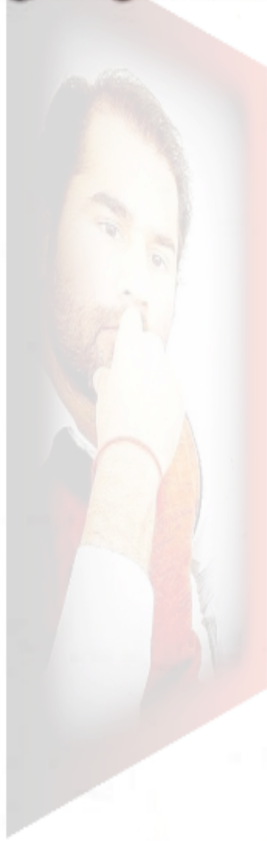
گھر سے نکلنے کی تیاری

بگ بینگ کے الارم پر آنکھ کھلی

کاما سوترا کو چوم کر تکیے کے نیچے رکھا

داس کیپٹال کی تلاوت کی

گارشیا کا لحاف پرے پھینکا

رئیلزم سے منہ دھویا

نہار منہ دو پیگ بائبل کے لیے

سارتر رنگ کا سوٹ پہنا

ماؤ چیک کی ٹائی باندھی

چی گویرا کے تسمے کسے

ہالی وڈ کا پرفیوم چھڑکا

لا یعنیت کی ای میل چیک کی

سینٹو سیٹو کو لو لیٹر لکھے

بٹوے میں سو سو کے دو مارکس

اور پچاس کا ایک لینن رکھا

بیگ میں پانچ ہزار سال کا بایو ڈیٹا

اور نطشے کے مرحوم خدا کا سفارشی رقعہ رکھا

نیرودا کی نظموں سے فال نکالی

بی بی سی کو پرنام کیا

اور ونڈوز 2000 سے انجانی منزل کو چل دیے

بریکنگ نیوز

کل رات ایک خوفزدہ شاعر نے
اپنی گیارہ منزلہ غزل کے مطلع سے گر کر خودکشی کر لی

ایک اور اطلاع کے مطابق
ایک قہوہ خانے میں تخلیق کار کی ایک سو بیس منزلہ نظم کو
دھماکے سے اڑا دیا گیا

شاعر ابھی تک نظم کے ملبے تلے دبا ہوا ہے
کہا جاتا ہے کہ شہر کے ادبی حالات انتہائی مخدوش ہوتے جا رہے ہیں
ادیبوں کی ایک بڑی تعداد یا تو زیرِ زمین چلی گئی ہے
یا اس نے لکھنا بند کر دیا ہے
اس کی بڑی وجہ شہر میں دندناتا ایک مافیا بتایا جاتا ہے
جسے خفیہ والوں کے علاوہ
بیرونی تھیوریوں کی سمگلنگ میں ملوث

نقادوں کی پوری مدد حاصل ہے

بتایا جاتا ہے کہ

وہ نوجوانوں سے شاعری کا بھتہ وصول کرتا ہے

پرانے دیوانوں میں نقب لگانا

اور کہانی کے خالی پلاٹوں پر قبضہ کر لینا اس کا معمول ہے

یہ مافیا رسائل کے ذریعے اغوا کاری

اور ٹارگٹ کِلنگ میں بھی ملوث بتایا جاتا ہے
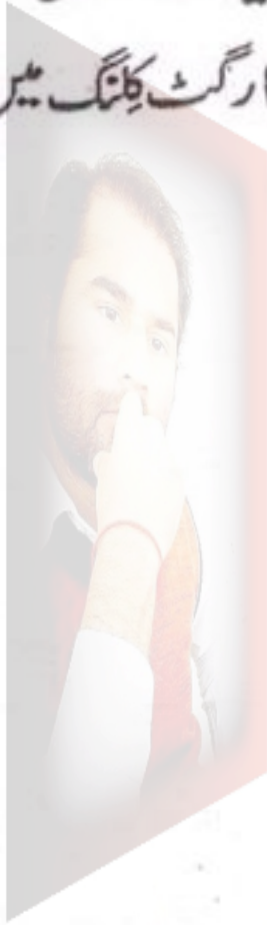
نظم کا بایو ڈیٹا

نظم آپ کو کہیں بھی مل سکتی
ہے
مسجد کی سیڑھیوں پر، گھر سے بھاگنے والی لڑکی کے بیگ میں
پبلک لیٹرینوں کی دیواروں پر، خودکشی کرنے والے کی جیب میں

نظم کو آپ کہیں بھی لے جا سکتے ہیں
کسی مزار پر، کسی گرجے کے پچھواڑے، جوا خانے میں
سبزی منڈی کے گوداموں میں، کال کوٹھڑی میں

نظم کسی کے ساتھ بھی سو سکتی
ہے
بانجھ عورت کے ساتھ، بدبودار سیٹھ کے بستر میں
مولوی کی چارپائی پر، سادھو کی کٹیا میں

نظم کو کوئی بھی پہن سکتا
ہے

حیض زدہ عورت بھی، نو بالغ لڑکی بھی، بوڑھا فقیر بھی

نظم کو کوئی بھی چھو سکتا ہے
اس کی رانوں پر، اس کے کولہوں پر، اس کے پاؤں کے ناخنوں پر

آپ نظم کو گنگنا سکتے ہیں
پینٹ کر سکتے ہیں
تہہ کر کے کپڑوں والی الماری میں رکھ سکتے ہیں

آپ نظم کے ساتھ ہنس سکتے ہیں
رو سکتے ہیں
ناراض ہو سکتے ہیں
اس کو وہ راز بتا سکتے ہیں جو محبوبہ سے بھی چھپا لینے چاہئیں
آپ نظم کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں
وہ آپ سے کوئی سوال نہیں کرے گی
صرف ایک بات کا خیال رکھیں
اگر آپ اس کے ساتھ ذرا سی بھی چالاکی کریں گے
تو یہ دوبارہ آپ کو نہیں ملے گی

گمنام سپاہی کی موت

یہ کٹی پھٹی زرد سی تصویر.............!

عالمی جنگ کے دوسرے سال

(اس کے آخری تارے سے تین ماہ اور تیرہ دن پہلے)

سنا ہے اسے آبدوز میں بحرِ مردار کی طرف جانے کا حکم ملا تھا

جہاں گہرے پانیوں کی وحشت ازلوں سے دھاڑ رہی ہے

جہاں اندھے سناٹوں کی گونج قرنوں سے براجمان ہے

یہ تو ممکن نہیں

کہ سات سمندر پار کسی جزیرے پر

وہ آج بھی زندہ ہو

اپنی نحیف اور بوڑھی تمناؤں کے ساتھ

لیکن ہو سکتا ہے

وہ اپنی کائی زدہ برباد آبدوز کے آس پاس کہیں محوِ خواب ہو

جہاں نہ کوئی قبر ہو

کہ جس پر تھوڑی سی گھاس اور کچھ پھول لہلہاتے ہوں

جہاں نہ کوئی کتبہ ہو

کہ جس پر اس کا نام، ولدیت اور کوئی تاریخ جگمگاتی ہو

مگر بحرِ مردار کے ساحلوں کے اس طرف

نصاب کی کتابوں میں

ایک جرنیل کا ذکر تو ہے

مگر کسی گمنام سپاہی کا نہیں

خیال کی دوری سے بھیجا گیا پیام

سردیوں کی بھیگتی شاموں میں

کھڑکی پار بے آواز بارش کی طرف دھیان لگائے

کسی خیال میں گم

ایک بے قرار خاموشی

اور ایک مضطرب سکوت کے ساتھ

بلغمی سانسوں کے شور میں

ویل چیئر پر کھانستی ماں کو سنبھالتے

ہاتھ میں دوائیاں اور پرچی تھامے

ہسپتال کی رہداری کے دوسرے کونے پر

میں نے تمھیں دیکھا

تمھیں شکایت تھی کسی لاتعلقی کی، بے مہری کی

شکوہ تھا اپنی تنہائی کا، اداسی کا
گلہ تھا اپنی آرزوؤں سے، خوابوں سے
تم مسلسل لڑ رہی تھی اپنے آپ سے، شاید کسی اور سے
میں نے تمھاری خود کلامیوں کو سنا

میں تمھاری پریشانیوں کو بانٹ سکتا تھا
تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتا تھا
میں نے تمھیں سوچا

مگر اس قدر جھمیلے میں اجنبیت کی دوری کا دریا
خیال کی دھنک سے کہاں پار ہو سکتا تھا؟

تم وہ نہیں تھیں جسے دفنایا گیا تھا

موت سے ایک روز پہلے

اس نے چپکے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا

"..........انا میکا!"

میں نے اس کے ہاتھوں کی نرمی

اور اس کے قرب کی خوشبو سے فوراً اسے پہچان لیا تھا

اگلے ہی دن

وہ اچانک سے، یونہی، زندگی سے اوجھل ہوگئی

بنا پوچھے، بغیر بتائے

میں نے آخری بار اسے چھوا، گلے لگایا، اس کے گال چومے

وہ اب انا میکا نہیں تھی

قبرستان سے واپسی پر میں نے دیکھا

وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی

بس مسکرائے جارہی تھی

میں اور وقت دونوں ہی جیسے چلنا بھول گئے

شاید سبھی کچھ تھم گیا تھا

میری دھڑکن بھی

میں بے بس تھا، بہت بے بس

پھر کسی نے چپکے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا

کسی جانی پہچانی خوشبو کا ایک احساس جاگا

"..........انامیکا!!"

نوسموکنگ ڈے پر پہلا کش

جب مجھے جنت سے نکال کر موت کو میرے پیچھے لگا دیا گیا

تو میں جان بچانے کے لیے صدیوں بھاگتا رہا

جنگلوں سے دوڑا، صحرا عبور کیے، بیابان چھوڑے

محل بنائے، قلعے تعمیر کیے

دریاؤں کو رام کیا، آندھیوں کو نکیل ڈالی

ستاروں کو نوچا، سورجوں پر کمند ڈالی

جرثوموں کی سلطنتیں تاراج کیں

غدودوں اور شریانوں کی خاک چھانی

اور پھر ایک دن پیچھے مڑ کے دیکھا

شاید موت میرا واہمہ ہے.........!

میں نے سوچا

اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا

نو سموکنگ ڈے پر دوسرا کش

مشین کے لیے انجن اور انجن کے لیے دھواں ناگزیر ہے.........

مشین کی ایجاد کے بعد ٹانگ پر ٹانگ رکھے
وہ اپنی ماہیت پر غور کرنے لگا
اسے بے اختیار ہنسی آ گئی
اور پھر اس نے پائپ میں تمباکو بھرا
سلگایا
اور دھواں چھوڑتا ہوا
کام پہ لگ گیا

نو سموکنگ ڈے پر تیسرا کش

ہم ننھے سے شعلے کو گدگداتے ہیں

اور موت سگرٹ کے دوسرے کنارے پر کھڑی مسکرانے لگتی ہے

تیسرے کش پر وہ ہمیں قریب،

پھر اور قریب آتی دکھائی دیتی ہے

اور ساتویں کش پر وہ دھواں اوڑھ کر اوجھل ہو جاتی ہے

ہم فضا میں گول گول چھلے بناتے سوچتے ہیں:

موت نیند کا

اور نیند بے خودی کا بھیس بدل کر

کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے

شہر مسلسل کھانس رہا ہے

مالیخولیا کی مریضہ ایک ڈائن

کے فریزر میں پڑا

شہر مسلسل کھانس رہا ہے

برف کی موٹی تہہ اوڑھے مسلسل چھینک رہا ہے

شہر کی سڑکیں، گلیاں اور بازار بالکل سُن ہو چکے ہیں

سنا ہے مال روڈ والی مسجد، سکول

میونسپلٹی کا دفتر اور عجائب گھر گل سڑ گئے ہیں

آسمان پر ہتھیلی بھر سورج اور چاند کی ایک پھانک بچی ہے

لوگ دن کے وقت بھی موم بتیاں جلائے گھومتے ہیں

انتظامیہ کے بقول حالات مکمل طور پر کنٹرول میں ہیں

نیوز کاسٹر تسلیاں دے رہے ہیں

دانشور ٹی وی پر مالیخولیا بارے مکالموں میں مصروف ہیں

مسجدوں سے بار بار اذانیں بلند ہو رہی ہیں

گھروں میں آیت کریمہ کے ختم کرائے جا رہے ہیں

چاروں اور برفیلے طوفان دندنا رہے ہیں

شہر فریزر میں پڑا مسلسل کپکپار رہا ہے

مگر ڈائن کو کچھ یاد نہیں
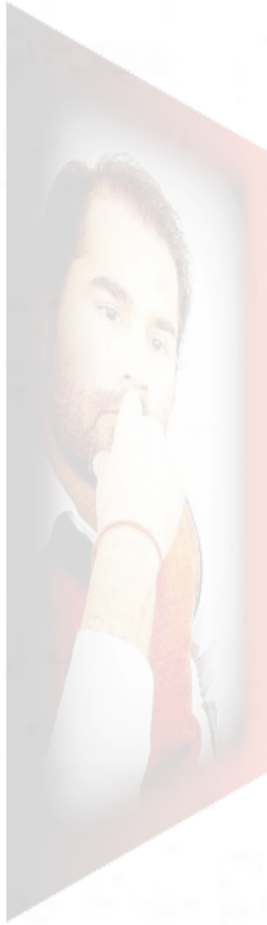
بے بسی احتجاج کر سکتی ہے

طاقت کھیلتی ہے
ابوغریب کے بے گناہ قیدیوں کے ساتھ
فلسطین کے معصوم لڑکوں کے ساتھ
لیاقت باغ میں نعرے لگاتے لوگوں کے ساتھ

طاقت ہنستی ہے
کارخانے کے گیٹ پر کھڑی ملازمہ کی امیدوں پر
اندھیرے بس سٹاپ پہ سہمی لڑکی کے اندیشوں پر
ہسپتال کی راہداری میں کھڑی بڑھیا کے آنسوؤں پر

طاقت چھیڑتی ہے
ٹی وی پر کسی جرنیل کے قہقہوں کے ذریعے

فلم کی کسی ایکسٹرا کی شوخیوں کے ذریعے
اخبار سے جھانکتے مجبور چہروں کے ذریعے

طاقت گھورتی ہے
جبری استعفے سے لَف بے بسی سے، جو افسانہ نہیں
طلاق نامے سے چپکی لاتعلقی سے، جو نظم نہیں
عدالتی حکم سے پکارتے الزام سے، جو انشائیہ نہیں

مکھیوں کو ناشتے میں ڈائنوسار کیوں دیتے ہو؟

"انقلاب ابھی دودھ پیتا بچہ ہے

اسے بڑا ہونے میں وقت لگے گا

مگر ہمارے پاس وقت نہیں ہے

ہم ہر روز بھوک اور ذلت کی میخوں پر

چوتڑ گھسیٹنے پر مجبور کیے جاتے ہیں

ہم تاریخ کی کروٹ کا انتظار نہیں کر سکتے

ہم ہر چیز جلا کر راکھ کر دیں گے.............."

اس نے تقریر ختم کی تو ہر طرف خاموشی چھا گئی

ایک ویران سی خاموشی
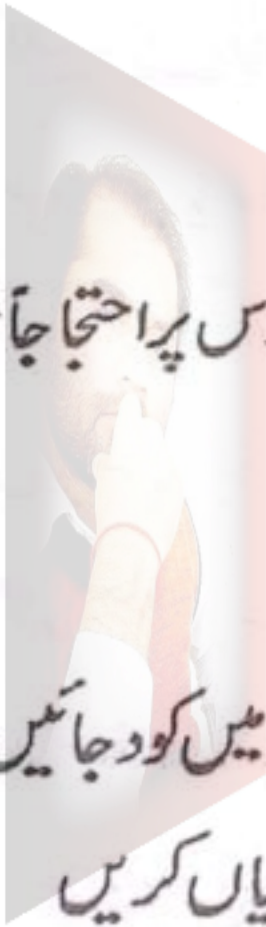
اچانک ایک بوڑھا قہقہہ لگاتے ہوئے اٹھا

اور بڑی سی گالی دے کر بولا:

"کامریڈ! تمھاری پینٹ کی زپ کھلی ہے......!"

احتجاج کی نئی بوطیقا-1

لعنت ہو تم پر!

تم سے تو وہ کسان اچھا ہے
جس نے ڈبلیو ٹی او کے اجلاس پر احتجاجاً خودکشی کر لی تھی
لیکن تمھیں کیا!
لوگ اپنی ڈگریاں جلائیں
اپنے بچوں سمیت دریاؤں میں کود جائیں
یا بھرے چوک میں خودسوزیاں کریں
تمھیں کیا!
تم لکھو آفاقیت کی حامل غزلیں، تجرید بھرے افسانے
اور چھپواتے پھرو لفظی بازی گری سے مزین نظمیں

اور خوشامد بھری تنقیدیں

لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لوگوں نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے

تمہارے لکھے پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے

اب تمہاری محفلوں کا رخ کرنے کو بھی کوئی تیار نہیں

اور اب تم اپنے جیسے چند ٹھکرائے ہوؤں کے ساتھ

چھپ چھپ کر ادبی مُشت زنی کرتے ہو

اور اپنے کیے پر شرمندہ بھی نہیں ہو

جانتے ہو وہ کون تھے!

جن کے لکھے ہوئے کو الہامی کتابوں سے زیادہ مقدس جانا گیا

جن کی تحریروں پر پابندیاں لگا دی گئیں

مگر انھیں حافظوں میں چھپا لیا گیا

شاید تمہیں یہ سب جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے

کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا جرم ثابت ہو چکا ہے

تمہارا فیصلہ لکھا جا چکا ہے

مگر تم انجان بن رہے ہو

اب انتظار کرو

جب تمہاری شاعری کا منہ کالا کر کے

اسے گلیوں میں پھرایا جائے گا

تمہارے افسانوں کے چوتڑوں پر درّے مارے جائیں گے
اور تمہاری تنقید کو سرِ عام مصلوب کر دیا جائے گا

احتجاج کی نئی بوطیقا-2

''منٹو زندہ تھا تو عوام کو امید تھی کہ جب بھی کہیں کوئی ناانصافی ہوگی، منٹو کے نوٹس میں آجائے گی اور پھر وہ سماج کو، عوام کو، حکومت کو مجبور کرے گا کہ اس حقیقت کے گھناؤنے گوشے کو کم از کم جھانک کے دیکھ لے''

غلط! بالکل غلط!!

تم کوئی شاعر ادیب نہیں صرف جھوٹے اور خود پرست ہو

تم نت نئے بہانوں سے ادب کی عزت سے کھیلتے آئے ہو

تم جھوٹ بولتے ہو اور ہر روز بولتے ہو

کہ ادب تمھارا اوڑھنا بچھونا ہے

تم ادیب کے روپ میں ڈاکو، قاتل، لٹیرے اور دہشت گرد ہو

تم وہی ہو جن کے خلاف ادب صدیوں سے برسرِ پیکار ہے

تمھیں یاد ہے

جب امریکی فوجیں معصوم جانوں پر یلغار کر رہی تھیں

تو تم حلقہ اربابِ ذوق میں بیٹھے

ادب کی لفظی جمالیات پر بحث کر رہے تھے

جب خودکش حملہ آور لوگوں کا قیمہ بنا رہے تھے

تو تم ایک جرنیل کے زیرِ صدارت نعتیہ مشاعرے پڑھتے پھر رہے تھے

اور جب صیہونی اپنے ناجائز باپ کی شہ پر

غزہ کی گلیوں میں فلسطینیوں کو بھون رہے تھے

تو تم مقصدیت اور سیاسیت کو

ادب سے خارج کرنے کی قرار دادیں پاس کروا رہے تھے

لعنت ہو تم پر.........!

دردکی شعریات-1

گو اس نظام کے اپنے گردے فیل ہو چکے ہیں

مگر پھر بھی یہ مجھے خصی کرنے پر تلا ہوا ہے

زر کی کوکھ سے جنم لینے والا یہ حرامی

جو ہماری محنت کا خون پی کر زندہ رہتا ہے

خدا، مذہب، مسکراہٹ

حسن، گیت اور نظم سب کی قیمت لگاتا ہے

چوبیس گھنٹوں کی ذلت اور اٹھارہ گھنٹوں کی مشقت کے عوض

چند روپوں کی بھیک میری جیب میں ڈالتا ہے

جو حکمرانوں کے زیرِ جاموں کی قیمت بھی نہیں

یہ مجھے دولے شاہ کا چوہا بننے پر مجبور کرتا ہے

مگر یہ نہیں جانتا کہ

خواب فیکٹریوں میں نہیں بن سکتے

جذبے بازاروں میں نہیں بک سکتے

آرزوؤں کی سیل نہیں لگائی جا سکتی

انھیں صرف شاعر جنتا ہے

نظموں کی صورت

اور جنتا رہے گا
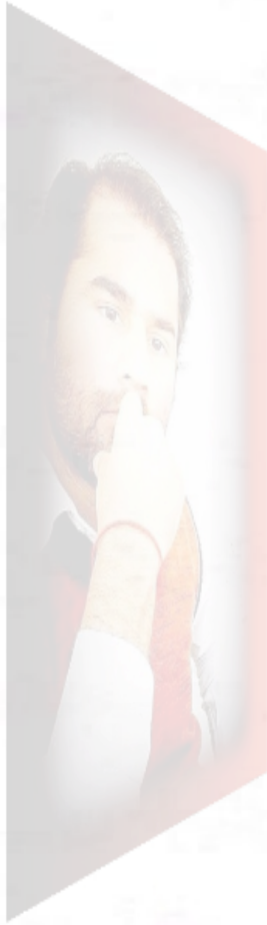
درد کی شعریات-2

خدا کی قسم! میں دہشت گرد نہیں ہوں

شہر کے موچیوں، نائیوں، کلچہ فروشوں

اور تانگہ بانوں سے پوچھ لو

مگر تمھیں ان کی گواہی سے کیا؟

تم بٹھاؤ عدالتیں، لگاؤ الزام اور چڑھا دو مجھے سولی پر

تمھیں میرے لفظوں میں ٹائم بم

اور باتوں میں کفر دکھائی دیتا ہے

تم اپنے گریبانوں کے بجائے ہوئے منافقوں کے خوف سے

باؤلے کتے بن گئے ہو

اور کسی کو بھی کاٹ سکتے ہو

اب تمھاری پبلک لیٹرینیں بھی خسارے میں جا رہی ہیں

شرم کرو

لوگوں نے ٹیکسوں کے خوف سے مُوتنا بھی چھوڑ دیا ہے

تتلیوں نے اجتماعی خودکشی کرلی ہے

اور پھولوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں

تم سے شہر کے گٹر تک سنبھالے نہیں جاتے

مگر تم دنیا فتح کرنے کے دعوے کرتے ہو

کیا تمھیں واقعی معلوم نہیں؟

ملک میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے

کیا تم یہ بھی بھول گئے

کہ پچھلے دنگوں میں مجھے سات مرتبہ قتل کیا گیا

اور گیارہ دفعہ میری سوچ لوٹنے کی کوششیں کی گئیں

مگر تم نے ایف آئی آر تک نہیں کاٹی

میں نے چند نظمیں کیا لکھیں

تم نے مجھے اشتہاری قرار دے دیا!

سُن لو! میں دہشت گرد نہیں ہوں، ایک شاعر ہوں

امن، محبت اور عدل کا

بغاوت، انقلاب اور غداری کا

میں نظمیں لکھوں گا اور تمھیں برباد کردوں گا

می لارڈ! میں تمھیں خبردار کرتا ہوں

میں !!

تاریخ کے فٹ پاتھوں پر پلا

ارتقا کی راہداریوں میں بڑھا

جسے روم کی شاہراہوں پر سرِ عام پھانسی دے دی گئی

جسے بغداد کی گلیوں میں بار بار بیچا گیا

جسے ہندوستان میں سپہ سالاروں کو تحفے میں دے دیا گیا

جسے مذہب کے نام پر جنگوں کی آگ میں جھونک دیا گیا

جسے وطن کے نام پر عقوبت خانوں کو رزق بنا دیا گیا

میں امن کی آواز

جسے خفیہ فوجی معاہدوں کی فصیلوں سے دھکیل دیا گیا

میں ایک تاریخی دستاویز

جسے آئینی ترمیموں میں زندہ درگور کر دیا گیا

میں آزادی کا گیت

جسے آئی ایم ایف کے تہہ خانوں میں دفن کر دیا گیا

میں وقت کی صداقت

جسے حکمرانوں نے اپنی تقریروں کا خام مال بنایا

میں لوگوں کے ہونٹوں سے لوٹی ہوئی مسکراہٹ

جسے آمر جرنیلوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا

میں ایک خوشخبری

جس کے انتظار میں لوگ بیٹھے بیٹھے کرسیاں بن گئے

دروازوں میں کھڑے کھڑے کواڑ بن گئے

لیکن پھر بھی

میں وہ گرد ہوں جو روکے نہ رکی

وہ شعلہ ہوں جو جھکائے نہ جھکا

میں ہمیشہ سے ہوں اور مسلسل ہوں

صدیوں کے دل میں

زمانوں کی دھڑکن میں

شاعر کے علاوہ ترقی پسند سوشیو پولیٹکل تجزیاتی نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی تحریریں معاصر اخبارات و جرائد میں سامنے آتی رہتی ہیں اور وہ اپنے افکار و خیالات کا اظہار لیکچرز اور مقالات کی صورت میں مختلف علمی و ادبی فورموں پر کرتے ہیں۔ رسائل و جرائد کی ادارت اور صحافتی کالم نویسی کے ساتھ ساتھ مصوری اور کارٹون سازی بھی ان کی دلچسپیوں کا مرکز ہے۔

نظم میرے لیے کیا ہے؟

اپنے اور نظم کے پچیس سالہ رشتے کے دوران
میں نے کبھی اس سوال کے جواب کی ضرورت ہی محسوس نہ کی
اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ......
نظم زمان و مکان کا جبر توڑتی ہے
میرے معلوم اور اختیار کو میرے نامعلوم اور بے اختیاری کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہے
تخیل کو لفظوں، تشبیہوں، تمثالوں، اصواتوں اور دیگر لسانی تکنیکوں میں ڈھالتی ہے
اور بے مواد ہیئتوں اور بے ہیئت موادوں کی تکمیل کرتی ہے
جو بے نام، بے شکل اور اجنبی سی خالی جگہوں کو بھی پر کر دیتی ہے
یوں میں اپنی سوچوں اور خواہشوں کے مطابق موجود کی تدوین کرتا ہوں
کچھ نیا بناتا ہوں، کچھ مکمل کرتا ہوں اور کچھ دوبارہ بناتا ہوں
اس پر کیف و پر جمال عمل کا ماحصل ایک محفوظ رہ جانے والی بے مثال حیرت
اور لازوال مسرت کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے؟

روشِ ندیم

القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ

Rs. 195